بے آواز گلی کوچوں میں

احمد فراز

بے آواز گلی کوچوں میں

احمد فراز

BE AWAZ GALI KUCHON MEIN

(Urdu Poetry)

by

AHMAD FARAZ

Year of Edition 2002

ISBN-81-87666-22-6

Price. Rs. 80/=

نام کتاب.........................بے آواز گلی کوچوں میں

مصنف. مد فراز

سن اشاعت.........................۲۰۰۲ء

قیمت.........................۸۰روپے

مطبع.........................کاک پرنٹرس، دہلی

Published by:

Kitabi Duniya

1955, Turkman Gate, Delhi-6 (INDIA)

E -mail kitabiduniya@rediffmail.com

ڈاکٹر عطیہ کے نام

شہرِ غزل کی گلیوں میں دلگیر ترے
تجھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں

ترتیب

ب

قیدِ تنہائی کی چند عبارتیں

ج

ایک بد نما صبح کے بارے میں کچھ نظمیں

ناموجود

اَے خدا تری مخلوق
جبر کے اندھیروں میں
دفن ہو چُکی کب کی
تیرے آسمانوں سے
نامزد فرشتوں کی
اَب سفارتیں کیسی

بے وجود بستی میں
لوگ اب نہیں رہتے
سِسکیاں سِسکتی ہیں
سائے سرسراتے ہیں
سُورجوں، ستاروں کی
اَب بشارتیں کیسی

دُوسری ہجرت

پھر مرے مکّے سے پیغمبر
ہجرت کر کے چلا گیا ہے
اور اب پھر سے
کعبہ کے زرم خوردہ بُت
اصنامِ طلائی
اپنی اپنی مسند پر آ بیٹھے ہیں
سچ کا لہُو
اُن کے قدموں میں
عُنابی قالین کی صُورت بچھا ہُوا ہے
کمخوابی خیموں کے اندر
بزمِ حریفاں پھر سجتی ہے
کذب و ریا کی دَف بجتی ہے

○

جاناں دِل کا شہر، نگر افسوس کا ہے
تیرا میرا سارا سفر افسوس کا ہے

کِس چاہت سے زہرِ تمنا مانگا تھا
اور اب ہاتھوں میں ساغر افسوس کا ہے

اِک دہلیز پہ جا کر دِل خوش ہوتا تھا
اب تو شہر میں ہر اک در افسوس کا ہے

جسم نے عشق گناہ سے بَرتر جانا تھا
اور دِل پر پہلا پتھر افسوس کا ہے

دیکھو اس چاہت کے پیڑ کی شاخوں پر
پھول اُداسی کا ہے، ثمر افسوس کا ہے

کوئی پچھتاوا سا پچھتاوا ہے فرازؔ
دُکھ کا نہیں افسوس، مگر افسوس کا ہے

○

شعر کسی کے ہجر میں کہنا حرفِ وصال کسی سے
ہم بھی کیا ہیں دھیان کسی کا اور سوال کسی سے

ساری متاعِ ہستی اپنی خواب و خیال تو ہیں
وُہ بھی خواب کسی سے مانگے اور خیال کسی سے

ایسے سادہ دِل لوگوں کی چارہ گری کیسے ہو
درد کا درماں اور کوئی ہو کہنا حال کسی سے

دیکھو اِک صُورت نے دِل میں کیسی جوت جگائی
کیسا سجا سجا لگتا ہے شہرِ ملال کسی سے

تُم کو زعم فرازؔ اگر ہے تم بھی جتن کر دیکھو
آج تلک تو ٹوٹ نہ پایا درد کا جال کسی سے

○

سویا تھا یا جاگ رہا تھا ہجر کی رات
آنکھوں پر محسوس کیئے ہیں اُس کے ہاتھ

اُسکو دیکھنا دیکھتے رہنا کافی تھا
لوٹ آیا ہوں دِل میں لے کر دِل کی بات

کیسے اب میں اوروں کو بے درد کہوں
میں بھی تھوڑی دُور گیا تھا اُس کے ساتھ

بُہت زمانوں بعد کوئی واپس آیا
لے کر بھُولی بسری یادوں کی سوغات

محوِ تکلم دُنیا بھر کے لوگوں سے
لیکن آنکھ میں وُہ ہے دِل میں اُسکی بات

شہرِ محبت کب سے خالی سا ہے
ہم بھی فرازؔ یہاں ہیں شاید رات کی رات

○

یہ میں بھی کیا ہوں اُسے بھول کر اُسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا ہمسفر اُسی کا رہا

وہ بت کہ دشمنِ دیں تھا بقول ناصح کے
سوالِ سجدہ جب آیا تو در اُسی کا رہا

ہزار چارہ گروں نے ہزار باتیں کیں
کہا جو دِل نے سخن معتبر اُسی کا رہا

بہت سی خواہشیں سو بارشوں میں بھیگی ہیں
میں کس طرح سے کہوں عمر بھر اُسی کا رہا

کہ اپنے حرف کی توقیر جانتا تھا فراز
اسی لیئے کفِ قاتل پہ سر اُسی کا رہا

○

ہم سے کہیں کچھ دوست ہمارے مت لکھو
جان اگر پیاری ہے پیارے مت لکھو

حاکم کی تلوار مقدس ہوتی ہے
حاکم کی تلوار کے بارے مت لکھو

کہتے ہیں یہ دار و رسن کا موسم ہے
جو بھی جس کی گردن مارے مت لکھو

لوگ الہام کو بھی الحاد سمجھتے ہیں
جو دل پر وجدان اُترے مت لکھو

وُہ لکھو بس جو بھی امیرِ شہر کہے
جو کہتے ہیں دَرد کے مارے مَت لکھو

خُود مُنصف پابستہ ہیں لب بستہ ہیں
کون کہاں اَب عرض گزارے، مَت لکھّو

کچھ اعزاز رسیدہ ہم سے کہتے ہیں
اپنی بیاض میں نام ہمارے مَت لکھو

دِل کہتا ہے کھُل کر سچی بات کہو
اور لفظوں کے بیچ ستارے مَت لکھو

○

فضا بے ابر شاخیں بے ثمر ہیں
پرندوں سے شجر محروم تر ہیں

کوئی موسم قرینے کا نہ آیا
ہواؤں کے سخن نا معتبر ہیں

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

بہت سے زخم تیرے نام کے تھے
اسی باعث بہت سے چارہ گر ہیں

پڑے ہیں قربتوں میں فاصلے وہ
کہ جو نزدیک تر تھے دُور تر ہیں

شبِ افسوس کے بُجھتے چراغو
ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی رات بھر ہیں

فراز اپنا مقدر سنگساری
ہمیں اِس عہد کے آئینہ گر ہیں

بن باس

میرے شہر کے سارے رستے بند ہیں لوگو
مَیں اس شہر کا نغمہ گر
جو دو اِک موسم غُربت کے دُکھ جھیل کے آیا
تاکہ اپنے گھر کی دیواروں سے
اپنی تھکی ہُوئی اور ترسی ہُوئی
آنکھیں سہلاؤں
اپنے دروازوں کے اُترتے روغن کو
اپنے اشکوں سے صیقل کرلُوں
اپنے چمن کے جلے ہُوئے پَودوں
اور گرد آلُود درختوں کی
مُردہ شاخوں پہ بین کروں
ہر مہجور ستوُن کو اتنا ٹوٹ کے چُوموں
میرے لبوں کے خُون سے

ان کے نقش و نگار سبھی جی اٹھیں
گلی کے لوگوں کو اتنا دیکھوں
اتنا دیکھوں،
میری آنکھیں
برسوں کی ترسی ہوئی آنکھیں
چہروں کے آنگن بن جائیں
پھر میں اپنا ساز اٹھاؤں
آنسوؤں اور مسکانوں سے جھلمل جھلمل
نظمیں غزلیں گیت سناؤں
اپنے پیاروں
درد کے ماروں کا درماں بن جاؤں
لیکن میرے شہر کے سارے رستوں پر
اب باڑیں ہیں لوہے کے کانٹوں کی
ہر دروازے پر کچھ پہرہ دار کھڑے ہیں
جو مجھ سے اور مجھ جیسے دل والوں کی
پہچان سے عاری
میرے سارے

سنگینوں سے بات کریں
میں اُن سے کہتا ہوں
دیکھو
میں اس شہر کا نغمہ گر ہوں
برسوں بعد کڑی راہوں کی
ساری اذیت جھیل کے اب واپس آیا ہوں
اس مٹی کی خاطر
جس کی خوشبوئیں
دُنیا بھر کی دوشیزاؤں کے جسموں کی مہکوں سے
اور سارے جہاں کے
سبھی گلابوں سے
بڑھ کر ہے
مجھ کو شہر میں
میرے شہر میں جانے دو
لیکن تنے ہوئے نیزوں نے
میرے جسم کو یوں برمایا
میرے ساز کو یوں ریزایا

میرا مہکتا خون اور میرے سسکتے نغمے
شہ دروازے کی دہلیز سے
رِستے رِستے
شہر کے اندر جا پہنچے ہیں
اور میں اپنے جسم کا ملبہ
ساز کا لاشہ
اپنے شہر کے شہ دروازے
کی دہلیز پہ چھوڑ کے
پھر انجانے شہروں کی شہراہوں پہ
مجبورِ سفر ہوں
جن کو تج کر گھر آیا تھا
جن کو تج کر گھر آیا تھا

○

شہرِ کتاب اُجڑ گیا، حرف برہنہ سر ہُوئے
نغمے سُرمہ در گلو، شعر دطن بدر ہُوئے

موسمِ درد کے صفیر جو بھی ندیم تھے، سو تھے
اب تو سبھی فریفتہ، دانہ و دام پر ہُوئے

جام و سبُو کی آبرُو اہلِ ہوس کے ہاتھ ہے
جب سے فقیہہ و محتسب شہر میں مُعتبر ہُوئے

سرو جواں کی موت پر روئیں گی قمریاں بہت
یُوں تو بفیضِ باغباں قتل کئی شجر ہُوئے

در خورِ حرفِ یار تھے جن کے سخن ہمیں فراز
آج وُہی ستم ظریف غیر کے نامہ بر ہُوئے

○

کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو
ہم لوگ نواگر ہیں ہمیں اِذنِ نوا دو

ہم آئینے لائے ہیں سرِ کوئے رقیباں
اے سنگ فروشو یہی الزام لگا دو

لگتا ہے کہ میلہ سا لگا ہے سرِ مقتل
اے دل زدگاں بازوئے قاتل کو دُعا دو

ہے بادہ گساروں کو تو میخانے سے نسبت
تُم مسندِ ساقی پہ کسی کو بھی بٹھا دو

میں شب کا بھی مجرم تھا سحر کا بھی گنہگار
لوگو مجھے اِس شہر کے آداب سِکھا دو

فیض کے فراق میں

اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دلوں سے یاد کریں
ہر سال
اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
تیری کویتا میری تیری دھرتی کی سچائی
تیرے بول ہیں سارے گونگے شہروں کی گویائی
تیرے گیت ہیں امن کی نَے اور آشتی کی شہنائی
آنگن اور چوپال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دِلوں سے یاد کریں
ہر سال
اے ماٹی کے لال

گو کہ تجھے دُنیا اپنائے لیکن اپنا شہر
اپنا شہر کہ حدِ نظر تک جیسے لہُو کی نہر
یا منصور و مسیح کی سُولی یا سُقراط کا زہر
ہم آشفتہ حال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں ہر سال
اے ماٹی کے لال
ہجر کی رت کتنے روز رہے گی
اور فقط کچھ روز
وصل کی ساعت آ پہنچے گی
اور فقط کچھ روز
راہ کی ہر دیوار گرے گی
اور فقط کچھ روز
گلے میں بانہیں ڈال تجھے سب یاد کریں
اے ماٹی کے لال
تجھے سب یاد کریں
تجھے سب یاد کریں

(سترویں سالگرہ پر)

○

سرو و صنوبر شہر کے مرتے جاتے ہیں
سارے پرندے ہجرت کرتے جاتے ہیں

پھر سے ٹوٹ کے رونے کی رُت آئی ہے
پھر سے دِلوں کے زخم نکھرتے جاتے ہیں

جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں
کیسے کیسے خواب بکھرتے جاتے ہیں

کیسے کیسے یاروں کا بہرُوپ کھُلا
کیسے کیسے خول اُترتے جاتے ہیں

ان حالوں کب اپنے آپ کو دیکھا تھا
کھنے کو دِن رات گزرتے جلتے ہیں

رہگیروں کی خاموشی کو غور سے سُن،
یُوں ہے جیسے ماتم کرتے جاتے ہیں

ماں مٹی نے خوں مانگا تھا اور بیٹے
پانی سے تالاب کو بھرتے جاتے ہیں

کبھی کبھی کوئی ایسا مسافر آتا ہے
رستے اپنے آپ سنورتے جاتے ہیں

کوئی نیا احسان کر ہمدم دیرینہ
جتنے پرانے زخم تھے بھرتے جاتے ہیں

شہرِ غزل کی گلیوں میں دِلگیر ترے
تجھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں

کب تک فگارِ دِل کو تو آنکھوں کو نم کریں
آؤ حدیثِ قاتل و بسمل رقم کریں

رِندو اُٹھاؤ جام کہ بس ہو چکی بہت
تا چند پاسِ بیعتِ شیخِ حرم کریں

آنکھوں کے طاقچوں میں جلا کر چراغِ درد
خونِ جگر کو پھر سے سپُردِ قلم کریں

تا چند جشنِ مرگِ رفیقاں منا کے ہم
اسبابِ دلنوازیٔ قاتل بہم کریں

بے آواز گلی کوچوں میں

دلقِ اویس و چادرِ زہرا کدھر گئی
دزدانِ نیم شب سے تقاضا تو ہم کریں

زخموں سے چُور جسم بنائیں نشانِ راہ
جو ہاتھ کٹ چکے ہیں اُنھیں کو قلم کریں

قیدِ تنہائی
کی
چند عبارتیں

ہانس کیمپ ۷۷ء

پہلی آواز

اتنا سناٹا کہ جیسے ہو سکوتِ صحرا
ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دُہائی دی ہے

جانے زنداں سے اُدھر کونسے منظر ہونگے
مجھ کو دیوار ہی دیوار دِکھائی دی ہے

دُور اک فاختہ بولی ہے بُہت دُور کہیں
پہلی آواز محبت کی سُنائی دی ہے

آشیاں گُم کردہ

عجب منظر سوادِ شام کے آنکھوں میں پھرتے ہیں
ہَوا سُورج کی مشعل کو جلاتی ہے بجھاتی ہے

اُفق پر کتنی تصویریں اُبھرتی ہیں بکھرتی ہیں
شفق میں آشنا چہروں کی رنگت پھیل جاتی ہے

تو دامانِ نظر میں بے محابا پھول کھلتے ہیں
تو جیسے جُوئبارِ یادِ یاراں گنگناتی ہے

وہ ہمدم مجھ کو حیران و پریشاں ڈھونڈتے ہوں گے
کہ جن کی مہرباں آنکھوں میں شبنم جھلملاتی ہے

قفس میں روزنِ دیوار و زخمِ در نہیں لیکن
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے

پچھلا پہر

نہ کہیں شہرِ مہرباں کی ہوا
نہ کوئی یارِ ہمدم و دمساز

نہ سرِ بام زُلفِ آوارہ
نہ سرِ راہ چشمِ فتنہ طراز

نہ کہیں کُوئے چاک داماناں
نہ کہیں رُوئے دوستانِ فراز

نہ کوئی بیت بیدل و غالب
نہ کوئی شعرِ حافظ شیراز

نہ کوئی شمعِ کشتۂ شب ہے
نہ کوئی عندلیبِ سینہ گداز

خلوتِ غم نہ بزمِ رُسوائی
نہ سوالِ طلب نہ عرضِ نیاز

چار سُو اک فصیلِ بے در ہے
چار جانب حصارِ بے انداز

نیند کے طائرانِ بے پروا
شاخِ مژگاں سے کر گئے پرواز

ایسی ویرانیوں سے گھبرا کر
جب اُٹھاتا ہُوں تیری یاد کا ساز

توڑ دیتی ہے سلسلے سارے
پہرہ داروں کی بدنُما آواز

بیادِ جاناں

دِل قفس میں بھی غزل خواں ہے بیادِ جاناں
غمِ جاں بھی غمِ جاناں ہے بیادِ جاناں

کب رگ و پے میں نہ تھا درد کا قاتل نشتر
آج پیوستِ رگِ جاں ہے بیادِ جاناں

یُوں صبا آتی ہے گلگشت کو، جیسے زنداں
کُوچۂ چاکِ گریباں ہے بیادِ جاناں

غزالاں تُم تو واقف ہو

غزالاں تم تو واقف ہو سو ہو مجنُوں پہ جو گزری
جو نالہ محملِ لیلےٰ میں تھا ہم بھی سمجھتے ہیں

ہَوس والوں کو کیا کیا ناز ہے اپنے قرینوں پر
مگر رسم و رہِ شہرِ وفا ہم بھی سمجھتے ہیں

یُونہی آئے نہیں ہیں کوچۂ چاکِ گریباں میں
مزاجِ دل محبّت کی ادا ہم بھی سمجھتے ہیں

"بہار آنے سے پہلے پیرہن میں آگ لگتی ہے
بسانِ لالۂ آتش قبا ہم بھی سمجھتے ہیں

پاس کیا تھا

پاس کیا تھا کہ لُوٹتی دُنیا
ہم تو کل بھی تھے بے سروساماں

آج دیوار کھنچ گئی ہے اگر
شہر کل بھی تھا صُورتِ زنداں

کب میّسر ہُوا تھا روزِ وصال
کب مقدّر نہ تھی شبِ ہجراں

اِک متاعِ سُخن تھی پاس اپنے
ایک سازِ وفا تھا دولتِ جاں

اب بھی خُوش بخت ہیں ترے وحشی
اب بھی خوش وقت ہیں ترے ناداں

درد قائم ہے یاد باقی ہے
اِک تری دید چِھن گئی جاناں

○

چاند رُکتا ہے نہ آتی ہے صبا زنداں کے پاس
کون لے جائے مرے نالے مرے جاناں کے پاس

اب بجز ترکِ وفا کوئی خیال آتا نہیں
اب کوئی حیلہ نہیں شائد دلِ ناداں کے پاس

چند یادیں نوحہ گر ہیں خیمۂ دل کے قریب
چند تصویریں جھلکتی ہیں صفِ مژگاں کے پاس

شہر ولے سب امیرِ شہر کی مجلس میں ہیں
کون آئے گا غریبِ شہرِ ناپُرساں کے پاس

لوگ کیوں کرتے ہیں اب چارہ گری کے تذکرے
اب بجز حرفِ تسلی کیا ہے غم خواراں کے پاس

اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہُوں

گیتوں سے تجھے سُبھانے والا
خوابوں سے تجھے سجانے والا
میں تیری اُداس ساعتوں میں
رَونے والا، رُلانے والا
میں تیری خُوشی کی محفلوں میں
نغموں کے چراغ لانے والا

ہر رَاہ میں تیرا ہمسفر ہُوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہُوں

اب ہاتھوں میں مرے ہتھکڑی ہے
اب پاؤں میں میرے بیڑیاں ہیں
اب دستِ صبا ہے دستِ قاتل
اب ابرِ کرم میں بجلیاں ہیں
اب حبسِ دوام میری قسمت
یا میرا نصیب پھانسیاں ہیں

میں اپنی خطا سے بے خبر ہوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

پھر بھی نہیں جی کو رنج کوئی
اور آنکھوں میں اشکِ خوں نہیں ہے
پھر بھی نہیں درد دل گرفتہ
میں نالہ بلب ہوں یوں نہیں ہے
دیکھوں تو بیاضِ شعر میری
اِک حرف بھی سرنگوں نہیں ہے

زنداں میں رہوں کہ اپنے گھر ہوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

ندیم آنکھیں ندیم چہرہ

ندیم چُپ تھا
مگر سدا کی شفیق آنکھوں پہ
دُکھ کی کائی جمی ہُوئی تھی
سدا کے اُس مہربان چہرے کا زخم
جو کب کا بھر چُکا تھا
وُہ پھر ہرا ہو کے کُنجِ لب سے دل و جگر تک پُہنچ چکا تھا
ندیم چُپ تھا
مُجھے تو ایسا لگا کہ جیسے
کسی نے اُس کے نحیف شانوں سے
اُسکے زندہ وجیہہ سر کو ہٹا کے
رُوبی کا ساختہ چہرہ سنگالیں
لگا دیا ہے۔

یہ کربِ ضبطِ الم کی حد تھی
بہت سے احباب جمع تھے

جب
عدالتِ عالیہ کے ایواں سے
مَیں حراست میں
باہر آیا
اِدھر اُدھر لوگ حال احوال پُوچھنے کے لیئے
کھڑے تھے
تو کشور و کامراں کی آنکھوں میں سِسکیاں
اور گلے میں آنسو اٹک گئے تھے
یہ وُہ گھڑی تھی
کہ میرے اندر کے حوصلوں کی
سبھی چٹانیں تڑخ رہی تھیں
وُہ زلزلہ سا وجُود میں تھا
کہ میری بُنیاد ہل رہی تھی
گناہ میرے قلم کا سچ تھا
اور اُسکی پاداشں میرے یاروں کو

میرے پیاروں کو مل رہی تھی
یہ ساعتِ جانستاں کڑی تھی
اور اس سے پہلے کہ سچ کا پندار
واہموں سے شکست کھاتا
ندیم کی مہربان آنکھیں
ندیم کے دلنواز لب مجھ سے کہہ رہے تھے
فراز ہم تم تو وہ ہیں
جن کے نصیب میں زندگی کی ساری اذیتیں ہیں
کہ جس مسافت پہ ہم چلے ہیں
وہ حرفِ حق کی مجاہدت ہے
ہمیں نہ حرصِ حشم نہ مال و منال کی آرزو رہی ہے
نہ ہم کو طبلِ و علم نہ جاہ و جلال کی جستجو رہی ہے
بس اِک قلم ہے کہ جس کی ناموس
ہم فقیروں کا کُل اثاثہ ہے آبرو ہے
بس ایک سچ ہے
کہ جسکی حُرمت کی آگہی ہے
مرے بدن میں ترے بدن میں

مرے قلم میں ترے قلم میں
وہی لہو ہے
کہ جس سے عرفان کی نمو ہے
کہ جس سے انساں کی آبرو ہے
ابھی سے تم ڈولنے لگے ہو
ابھی سے نگہ کے مقابلے میں صعوبتیں تولنے لگے ہو
مجھے بھی دیکھو
کہ جس کے پیراہنِ دل و جاں پہ ساٹھ
پیوند لگ چکے ہیں
تمام پیوند زندگی کی ودیعتیں ہیں
مگر مجھے مضمحل بھی دیکھا!؟
کبھی مجھے منفعل بھی دیکھا!؟
مَیں اب بھی دشتِ وفا میں گرمِ سفر ہُوں گرمِ سفر رہا ہُوں
کہ میں سمجھتا ہُوں
یہ وُہ صحرائے درد ہے جس میں
تشنگی ہے، گرسنگی ہے، برہنگی ہے
یہاں ملامت کے سنگ ___ طعنوں کے تیر

شرمندگی کے خنجر برس رہے ہیں
یہاں تو ہر راہرو کی گردن میں طوق پاؤں میں بیڑیاں ہیں
یہاں تو زنداں کی ظلمتیں اور قتل گاہوں کی لالیاں ہیں
مگر کبھی مَیں رُکا نہیں ہُوں، مگر کبھی مَیں جُھکا نہیں ہُوں
یہی تو دشتِ وفا ہے جس میں
تمھارے جسموں ہمارے جسموں
کے ہر طرف استخواں پڑے ہیں
یہی تو وُہ راستے ہیں جن میں
صداقتوں کے امیں لڑے ہیں
فقط ہمیں تو نہیں اکیلے
یہاں بہت سے عَلم گڑے ہیں
انھیں کے ایثار سے ہی جانبر صداقتیں ہیں
انھیں کے افکار سے ہی
ہم اہلِ دِل کی باہم رفاقتیں ہیں

تمھارے بازو ابھی توانا ہیں
جسم میں خُون کھولتا ہے

قلم سے عہدِ وفا کیا ہے
قلم تو پھر سچ ہی بولتا ہے
اُٹھاؤ آنکھیں کہ پھر امر ہے
قلم کا وجدان مُعتبر ہے

مَیں کُنجِ زنداں میں آ چکا ہُوں
مگر ابھی تک
مری نگاہوں کے سامنے ہیں
ندیم آنکھیں ندیم چہرہ

○

ہر کوئی طرۂ پیچاک پہن کر نِکلا
ایک مَیں پیرہنِ خاک پہن کر نِکلا

اور پھر سَب نے یہ دیکھا کہ اسی مقتل سے
میرا قاتل میری پوشاک پہن کر نِکلا

ایک بندہ تھا کہ اوڑھے تھا خُدائی ساری
اِک ستارہ تھا کہ افلاک پہن کر نِکلا

ایسی نفرت تھی کہ اس شہر کو جب آگ لگی
ہر بگولہ خس و خاشاک پہن کر نِکلا

ترکش و دامِ عبث لے کے چلا ہے صیاد
جو بھی نخچیر ہے فتراک پہن کر نکلا

اُس کے قامت پہ اُسے جان گئے لوگ فرازؔ
جو لبادہ بھی وہ چالاک پہن کر نکلا

قاصد کبوتر

یہ لہو
جس سے بھرے
شہروں کے سارے راستے
گمگوں ہیں
اور ہر پیرہن کا رنگ عنابی ہے
کل کے موسموں
اور آنے والے
سورجوں
کا زمزمہ گر ہے۔

چلو تم نے تو
کالی سُرخیاں
مقراض کر ڈالیں
سخن زنجیر کر ڈالے
قلم زنجیر کر ڈالے
مگر اب ان ہواؤں کو بھی روکو
جو تمھارے مقتلوں کی لالیاں
اور تازہ خُوں کی خُوشبُوئیں
اور اُن کی آوازیں لیئے
گلیوں سے
بازاروں سے
شہراہوں سے ہو کر
ہر طرف
قریہ بہ قریہ
پھیلتی جاتی ہیں
نادانو
ہوائیں نامہ بر بنتی ہیں
جب قاصد کبوتر قید ہوتے ہیں۔

عفریت

خوفزدہ مائیں
بچوں کو سینوں سے لپٹائے
تھر تھر کانپ رہی ہیں

بستی والے کہتے ہیں
برسوں سے
اس قریہ میں
اک آدم خور عفریت ہے
جس کے بہت سے چہرے ہیں
اور جس گھر میں بھی
کسی صدا کی شمع جلے

یا کسی دُعا کا پھول کھلے
وُہ صُبح سے پہلے
سارے گھر کو کھا جاتا ہے

کتنی بار کئی

دِل والے
اپنے دُکھی سینوں میں غم کے جگر جگر انگارے
اور زخمی آنکھوں میں
جگمگ جگمگ تارے لے کر

اس عفریت کی کھوج میں نکلے
لیکن اگلی شام
اس ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈی پر
جو کالے سانپوں
اور پیلے کانٹوں والے
جنگل کو جاتی ہے
اُن کے سر
انکے بازو

اُن کی آنکھیں
لہولہان
اور الگ الگ اور ٹکڑے ملی ہیں

اس منظر کی دید سے اب تک
بستی والوں کے
مُنہ پر
اور آنکھوں پر
خود اُنکے اپنے ہاتھ دھرے ہیں

○

اب لوگ جو دیکھیں گے تو خواب اور طرح کے
اس شہر پہ اُتریں گے عذاب اور طرح کے

اب کے تو نہ چہرے ہیں نہ آنکھیں ہیں نہ لب ہیں
اس عہد نے پہنے ہیں نقاب اور طرح کے

اَب کُوچۂ قاتل سے بلاوا نہیں آتا
قاصد ہیں کہ لاتے ہیں جواب اور طرح کے

سو تیر ترازُو ہیں رگِ جاں میں تو پھر کیا
یاروں کی نظر میں ہیں حساب اور طرح کے

اس درد کے موسم نے عجب آگ لگائی
جسموں میں دہکتے ہیں گلاب اور طرح کے

واعظ سے فراز اپنی بنی ہے نہ بنے گی
ہم اور طرح کے ہیں جناب اور طرح کے

○

پیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ
ہم نے سر گرتے ہوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ

باغبانوں کو عجب رنج سے تکتے ہیں گلاب
گلفروشش آج بہت جمع ہیں گلزار کے بیچ

قاتل اس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
ایک درویش بھی دیکھا اسی دربار کے بیچ

کج اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عشاق
کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ

تم ہو ناخوشش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فراز
لوگ رہتے ہیں اسی شہرِ دل آزار کے بیچ

○

اپنی ہی آواز کو بے شک کان میں رکھنا
لیکن شہر کی خاموشی بھی دھیان میں رکھنا

میرے جھوٹ کو کھولو بھی اور تولو بھی تم
لیکن اپنے سچ کو بھی میزان میں رکھنا

کل تاریخ یقیناً خود کو دُہرائے گی
آج کے اِک اک منظر کو پہچان میں رکھنا

بزم میں یاروں کی شمشیر لہُو میں تر ہے
رزم میں لیکن تلواروں کو میان میں رکھنا

آج تو لمحے دل ترکِ تعلق پر تم خوش ہو
کل کے پچھتاوے کو بھی امکان میں رکھنا

اِس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
اور وُہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

اس موسم میں گُلدانوں کی رسم کہاں ہے
لوگو اب پھولوں کو آتشدان میں رکھنا

○

وُہ ظلمتیں ہیں کہ شاید قبولِ شب بھی نہ ہوں
مگر حصارِ فلک میں شگاف اب بھی نہ ہوں

تمام شہر ہے شائستگی کا زہر پیئے
نہ جانے کیا ہو جو دو چار بے ادب بھی نہ ہوں

وُہ ساعتیں ہیں عنایاتِ چشم و لب تو گئیں
وُہ چاہتے ہیں حکایاتِ چشم و لب بھی نہ ہوں

ہر اک پہ وا نہ کرو شہرِ دِل کا دروازہ
کہ آنے والوں میں دزدانِ نیم شب بھی نہ ہوں

مُجھے تو ڈر ہے کہ شیخِ حرم کے ہاتھوں سے
کہیں مری طرح رُسوا رسول و رب بھی نہ ہوں

○

نبھائی وضعِ بسمل انتہا تک
نہ مانگا قاتلوں سے خوں بہا تک

نہ جانے کیا ہوا زندانیوں کو
کہ بے آواز ہے زنجیرِ پا تک

اُڑا کر لے گئیں ان موسموں میں
ہوائیں بے نواؤں کی ردا تک

وفا کے نام پر کچھ شعبدہ گر
چرا لیتے ہیں ہاتھوں کی حنا تک

فراز آنکھیں گنوائیں عمر کھو دی
کہا تھا کس نے اس کا راستہ تک

میرے عصر کے مُوسیٰ

مالک
میں لفظوں کا گڈریا
حرفوں کے بُزغالے
میری دُنیا ہے
اس دُنیا اور اسکے دُکھوں کے
بھونچالوں سے
جب بھی مُجھے پل دو پل ملتے
اور تجھے
سارے افلاک
اور ساری زمینوں
کے سارے بسنے والوں کے
سارے جُھوٹ اور سارے سچ کے
جنجالوں سے مُہلت ملتی
ہم آپس میں باتیں کرتے

سیدھی سچی پیاری باتیں
جبر اور مکر سے عاری باتیں
تُو شبنم تھا تُو موتی تھا تُو خوشبُو تھا
مَیں تپا تھا مَیں پتھر تھا مَیں آنسُو تھا
لیکن میل رہا دونوں کا
دونوں ہی نے اکثر
سُنا کہا دونوں کا
مالک
مَیں نے اکثر سوچا
تو جس کو
دِن کا آرام
نہ راتوں کی نیندیں حاصل ہیں
ساری دُنیاؤں کی مسافت
کرتے کرتے
اپنے گلّوں اور گلّوں کے چرواہوں کی
چاہت کا دَم بھرتے بھرتے
شہد کی نہریں زہر کے ساگر

تکتے تکتے

کبھی کبھی تھک جاتا ہوگا
تیرے گیسو
کاہکشاں کی دُھول سے اَٹ جاتے ہونگے
اور تیرے شانے
سارے زمانے کے انبار سے
دُکھتے ہوں گے
تیرے پاؤں
ازل سے لے کر ابد تک
پھیلے ہُوئے صحراؤں کے سفر سے
چھالوں سے پٹ جلتے ہوں گے
اور تیرے پیوند لگے
ملبُوس کے بخیئے
شاید جگہ جگہ سے
نکل چُکے ہوں
مالک
تُو اِک روز اگر

سارے زمانے سارے ٹھکانے سارے فسانے
بھول کے میرے پاس آنے تو
میں تیرے ریشم جیسے
لانبے بالوں کو
بستی کے واحد چشمے کے
چاندی جیسے پانی سے دھوؤں
تیرے تھکے ہوئے شانوں کو
آہستہ آہستہ دابوں اور سہلاؤں
تیرے چھلنی چھلنی پاؤں کے تلوؤں سے
ساری تھکن کے کانٹے چن لوں
تیرے دریدہ پیراہن کے
اک اک چاک کو ٹانکوں
اور جب تجھ کو پیاس لگے
یا بھوک لگے تو
سچے لفظوں کی سب سے اچھی بھیڑوں کا
خالص تازہ دودھ پلاؤں
اور پھر تجھ کو

اپنی نے کی روتی ہوئی آنکھوں کے
سسکتے گیت سناؤں
تاکہ تو صدیوں کا جاگا تھکا ہُوا
اس کھلی فضا کے میدانوں میں
کچھ لمحوں کو سو جائے ___ آرام کرے
مالک

تو میری باتوں پر
کتنی محبت سے ہنستا ہے
لیکن میرے عصر کے موسیٰ
برہم ہیں

○

مکین خوش تھے کہ جب بند تھے مکانوں میں
کھلے کواڑ تو تالے پڑے زبانوں میں

درخت ماؤں کی مانند انتظار میں ہیں
طیور لوٹ کے آئے نہ آشیانوں میں

ہوا کی زد پہ بھی دو اک چراغ روشن ہیں
بلا کے حوصلے دیکھے ہیں سخت جانوں میں

مجھے ہلاک کیا اعتماد نے میرے
کہ میکبتھ تھے سبھی میرے میزبانوں میں

کل آئینے نے بڑے دکھ کی بات مجھ سے کہی
فراز تو بھی ہے گزرے گئے زمانوں میں

○

عشق کا شہر بھی دیکھو کیا نیرنگ بھرا ہے
اب دیوانے کا دامن بھی سنگ بھرا ہے

اب یہ کھلا ہے کتنی پرانی دشمنیاں تھیں
یاروں میں ہر ایک کا خنجر زنگ بھرا ہے

میرے بدل جانے پر تم کو حیرت کیوں ہے
میں نے یہ بہروپ تمہارے سنگ بھرا ہے

قتل گہوں کا رستہ اوروں سے کیا پوچھیں
لہو کے چھینٹوں سے اک اک فرسنگ بھرا ہے

بولتی آنکھوں کی چُپ بھی قاتل ہے لیکن
اُس کے سکُوتِ چشم میں جو آہنگ بھرا ہے

کچھ تو فرازؔ اپنے قصّے بھی ایسے ہی تھے
اور کچھ کہنے والوں نے بھی رنگ بھرا ہے

○

اب کے ہم پر کیسا سال پڑا لوگو
شہر میں آوازوں کا کال پڑا لوگو

ہر چہرہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہُوا
اب کے دِلوں میں ایسا بال پڑا لوگو

جب بھی دیارِ خندہ دلاں سے گزرے ہیں
اس سے آگے شہرِ ملال پڑا لوگو

آئے رُت اور جائے رُت کی بات نہیں
اب تو عمروں کا جنجال پڑا لوگو

تلخ نوائی کا مجرم تھا صرف فراز
پھر کیوں سارے باغ پہ جال پڑا لوگو

○

جانے کس زعم میں مقتل کو سجائے تم ہو
مجھ کو کیا قتل کرو گے مرے سائے تم ہو

میرا پندار بڑھا ہے اسی معیار کے ساتھ
جس رعونت سے مجھے دار پہ لائے تم ہو

اس خجالت کے تبسم سے عیاں ہیں یارو
آستینوں میں وہ خنجر کہ چھپائے تم ہو

دوست کا لطف تو احسان ہے جب ہو جائے
مہرباں پھر بھی بڑی دیر میں آئے تم ہو

دست بستہ و کمر بستہ و لب بستہ سہی
اس پہ بھی خوش ہو کہ دربار میں آئے تم ہو

ہائے وہ صبحِ تمنا کہ نہ دیکھو گے فراز
ہائے اُن شمعوں کی قسمت کہ جلائے تم ہو

○

اِک بُوند تھی لہُو کی سرِ دار تو گری
یہ بھی بُہت ہے خوف کی دیوار تو گری

کچھ غُنچوں کی جُراَتِ رندانہ کے نِثار
اَب کے خطیبِ شہر کی دستار تو گری

کچھ سر بھی کٹ گرے ہیں پہ کہرام تو مچا
یُوں قاتلوں کے ہاتھ سے تلوار تو گری

جم گیا ہے آنکھوں میں ایک بد نُما منظر
اب تو سب کے سب چہرے قاتلوں سے لگتے ہیں

دِل کا قصّہ یا افسانہ دار کا ہے
ہر محفل میں ذِکر اُسی دِلدار کا ہے

○

سارا شہر بلکتا ہے
پھر بھی کیسا سکتہ ہے

ہر کوئی تصویر نما
دُور خلا میں تکتا ہے

گلیوں میں بارُود کی بُو
یا پھر خُون مہکتا ہے

سب کے بازو بیخ بستہ
سب کا جِسم دہکتا ہے

ایک سفر وہ ہے جس میں
پاؤں نہیں دِل تھکتا ہے

تیرا بچھڑنا جانِ غزل
شہرِ غزل کا مقطع ہے

تُو نے کب یہ سوچا ہے معصوم ہے کون اور قاتل کون
تُو نے کب یہ دیکھا ہے کوئی چہرہ کیسا لگتا ہے
ایسے بھی ہوتے ہونگے جن سے سُولی بھی شرماتی ہو
ایسے بھی جن سے دار کا تختہ سجا سجا سا لگتا ہے

جھوٹ کا عمامہ ہے کوئی یا پرچم ہے سچائی کا
تو کیا جانے کس کے مُنارۂ سر پہ کمند افگندہ ہے
وہ منصور کا حرفِ انا ہو یا عیسیٰ کی شمعِ دعا
تجھ کو کیا نخچیر ترا کوئی مولا ہے یا بندہ ہے

درباروں سے ہو کر جب انصاف کا قاصد آتا ہے
سب کو خبر ہے بے گنہی کا اکثر جو انجام ہُوا

میزانیں کِن ہاتھوں میں تھیں جُنبشِ ابرُو کِس کی تھی
کِس پہ اہلِ عدالت گرجے کِس پر لُطف اکرام ہُوا

محفل محفل مقتل مقتل سب بسمل جلاد ہے کون
کوئی سمجھ کر بھی نہیں سمجھے کوئی اشارہ جانے ہے

نام ہے کِس کا دام ہے کِس کا اور یہاں صیاد ہے کون
"جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے"

چلو اُس شہر کا ماتم کریں

چلو اُس شہر کا ماتم کریں
جس کے سبھی موسم ہمیں پیارے تھے
وُہ رُت چاک دامانی کی تھی
یا خوں رونے کی
ہوائے مہرباں کی راہ تکنے کا زمانہ تھا
کہ فصلِ لالۂ لعلیں کی حسرت میں
بدن انگار ہونے کی
سبھی موسم ہمیں پیارے رہے اس شہر کے
جو بد مقدر تھا
کہ جس کی ساری دیواریں فصیلیں تھیں
کوئی روزن نہ رکھتی تھیں
وُہ جس کی دُود کش پہنائیاں
آنکھیں جلاتی تھیں
مگر روشن نہ رکھتی تھیں

ڈری سہمی ہوئی خلقت کی لاشیں
اس لئے گلیوں میں پھرتی تھیں
کہ وہ مدفن نہ رکھتی تھیں
مگر پھر بھی ہمیں اس شہر سے
کتنی محبت تھی

محبت ہے
کہ یہ شہرِ سحر ناآشنا
جس کا مقدر رات تھی یا صبحِ کاذب تھی
گلی کوچوں میں
بازاروں میں
دہلیزوں پہ بیٹھے منتظر لوگو
تمھیں بھی صبحِ صادق کا تصوّر
خواب پیارا تھا
ہمیں بھی تھا
چلو تاروں کا قتلِ عام بھی ہم کو گوارا تھا
ہمیں بھی اور تمھیں بھی
جن سیہ راتوں نے مارا تھا

یہی سُنتے رہے ہم تم
انھیں کے دامنوں میں صُبحِ صادق کا ستارا تھا
مگر اس مرتبہ
جس جھٹپٹے کو
روشنی کا اولیں زینہ سمجھ بیٹھے
اُسی کی آخری منزل پہ
اب سُورج کی پیلی لاش رکھی ہے
(کسی آسیب نے شب خوں مارا تھا)
مگر اب سب کے چہرے اس قدر فق
اور بازُو اس قدر شل ہیں
کہ جیسے کور چشماں گور کن
مصلوب سُورج کی بجائے
شہر کو دفنا کے آئے ہیں
چلو اُس شہر کا ماتم کریں
جس کے سبھی موسم ہمیں پیارے رہے
اور ہم جسے خُود اپنے ہاتھوں سے
کفن پہنا کے آئے ہیں
جسے دفنا کے آئے ہیں۔

حرف کی شہادت

آؤ جس عیسیٰ کو ہم نے سُولی پر لٹکایا ہے
اُس کے لہُو لہان بدن پر بین کریں
اور اشک بہائیں
فرض میں پُورے اُتر چکے
اب قرض چکائیں

اس کی گھڑاؤں وُہ لے جائے
جس نے صلیب بنائی تھی
چادر کا حقدار وُہی ہے
جس نے کیل لگائی تھی
اور کانٹوں کا تاج ہے اُس کا
جس کی آنکھ بھر آئی تھی

آؤ
اب ہم سب عیسیٰ ہیں
لوگوں کو بتلائیں
مُردوں کو زندہ کرنے کا
مُعجزہ بھی دکھلائیں
لیکن اُس کا حرف تھا سب کچھ
حرف کہاں سے لائیں؟

○

جب یار نے رختِ سفر باندھا کب ضبط کا یارا اُس دِن تھا
ہر درد نے دِل کو سہلایا کیا حال ہمارا اُس دِن تھا

جب خواب ہُوئیں اُسکی آنکھیں جب دُھند ہُوا اُس کا چہرہ
ہر اشک ستارہ اُس شب تھا ہر زخم انگارہ اُس دِن تھا

سب یاروں کے ہوتے سوتے ہم کِس سے گلے مِل کر روتے
کب گلیاں اپنی گلیاں تھیں کب شہر ہمارا اُس دِن تھا

جب تجھ سے ذرا غافل ٹھہرے ہر یاد نے دِل پہ دستک دی
جب لب پہ تمہارا نام نہ تھا ہر دُکھ نے پُکارا اُس دِن تھا

اک تم ہی فرازؔ نہ تھے تنہا اب کے تو بلاوا جب آیا
اک بِھیڑ لگی تھی مقتل میں ہر درد کا مارا اُس دِن تھا

○

لباس دار نے منصب نیا دیا ہے اُسے
وہ آدمی تھا مسیحا بنا دیا ہے اُسے

مگر سکوتِ فلک بھی زمین جیسا تھا
دُعائے نیم شبی نے بھی کیا دیا ہے اُسے

سفر طویل نہ درپیش ہو مُسافر کو
جو نصفِ شب سے بھی پہلے جگا دیا ہے اُسے

وُہ سب حرُوف کہ بے شکل تھے سلامت ہیں
جو لفظ چہرہ نما تھا مِٹا دیا ہے اُسے

کچھ اپنے شہر کا قاتل بھی بے مروت تھا
کچھ اپنے عجز نے بھی حوصلہ دیا ہے اُسے

فغاں کہ اہلِ ہوس کی رقابتوں نے فراز
جو شخص جانِ جہاں تھا گنوا دیا ہے اُسے

○

رت جگے ہوں کہ بھرپور نیندیں مسلسل اُسے دیکھنا
وُہ جو آنکھوں میں ہے اور آنکھوں سے اوجھل اُسے دیکھنا

اِس کڑی دُھوپ میں دِل تپکتے ہیں اور بام پر وُہ نہیں
کل نئے موسموں میں جب آئیں گے بادل اُسے دیکھنا

وُہ جو خوشبُو بھی ہے اور جگنو بھی ہے اور آنسو بھی ہے
جب ہَوا گنگنائے گی ناچے گا جنگل اُسے دیکھنا

جو ہواؤں میں ہے اور فضاؤں میں ہے اور دُعاؤں میں ہے
کوئی پھیلائے دامن کہ لہرائے آنچل اُسے دیکھنا

شاعری میں بھی اس جانِ جاں کا سراپا سماتا نہیں
اور آنکھوں کی دیرینہ خواہش مکمل اُسے دیکھنا

یہ بھی کیا سوچنا ہے کہ ہر وقت ناداں اُسے سوچنا
یہ بھی کیا دیکھنا ہے کہ ہر سمت پاگل اُسے دیکھنا

شامِ وعدہ سہی دُکھ زیادہ سہی پھر بھی دیکھو فراز
آج شب اُسکی فُرقت میں کہہ لو غزل کل اُسے دیکھنا

○

جو کچھ کہیں تو دریدہ دہن کہا جائے
یہ شہر کیا ہے یہاں کیا سخن کہا جائے

بضد ہے تیشۂ خونیں لئے ہوئے کوئی شخص
کہ گورکن کو بھی اب کوہکن کہا جائے

اگر ہجومِ صداؤں کے دیکھنا چاہو
تو شرط یہ ہے کہ پہلا سخن کہا جائے

چراغ بجھتے ہی رہتے ہیں پر جو اب کے ہوا
اسے ہواؤں کا دیوانہ پن کہا جائے

عجیب رسم ہے جو صدرِ انجمن ہو فراز
وہ چاہتا ہے اسے انجمن کہا جائے

○

گرفتہ دِل عندلیب گھائل گلاب دیکھے
محبتوں نے سبھی رُتوں میں عذاب دیکھے

وہ دن بھی آئے صلیب گر بھی صلیب پر ہوں
یہ شہر اِک روز پھر سے یومِ حساب دیکھے

یہ صُبحِ کاذب تو رات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گزر گئیں آفتاب دیکھے

وہ چشمِ محرُوم کتنی محرُوم ہے کہ جس نے
نہ خواب دیکھے نہ رنگوں کے عذاب دیکھے

کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہروں پہ آبلے ہیں
اور آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے

عجب نہیں ہے جو خوشبوؤں سے ہے شہر خالی
کہ میں نے دہلیزِ قاتلاں پر گلاب دیکھے

یہ ساعتِ دید اور وحشت بڑھا گئی ہے
کہ جیسے کوئی جنوں زدہ ماہتاب دیکھے

مجھے تو ہم مکتبی کے دن یاد آ گئے ہیں
کہ میں اُسے پڑھ رہا ہوں اور وہ کتاب دیکھے

دشمن کا قصیدہ

ہم کہ تلوار کے دشمن تھے
کہ تلوار عدو تھی اپنی
اب مدح خواں ہیں
کہ تلوار کا کردار بھی تھا
اور حریف اپنا
کوئی یارِ جگر دار بھی تھا
اور وہ یارِ جگر دار طرحدار بھی تھا

نہ کہ بارُود کی نالی
نہ کہ فولاد کا خول
نہ کہ بُزدل کا مُوقف
نہ کہ کم ظرف کا بول
کہ ہمیشہ رہی تلوار
کسی حرفِ صفا کی مانند

سچ کے پرچم کی طرح
دِل کی صدا کی مانند
نہ کہ مُلّا کی قبا اور ریا کی مانند
نہ منافق کی دُعا کی مانند

○

وفا کے بھیس میں کوئی رقیبِ شہر بھی ہے
حذر کہ شہر کا قاتل طبیبِ شہر بھی ہے

وُہی سپاہِ ستم خیمہ زن ہے چاروں طرف
جو میرے بخت میں تھا اب نصیبِ شہر بھی ہے

اُدھر کی آگ اِدھر بھی پہنچ نہ جائے کہیں
ہوا بھی تیز ہے جنگل قریبِ شہر بھی ہے

اب اُس کے ہجر میں روتے ہیں اسکے گھائل بھی
خبر نہ تھی کہ وہ ظالم حبیبِ شہر بھی ہے

یہ راز نعرۂ منصور ہی سے ہم پہ کھلا
کہ چوبِ منبرِ مسجد صلیبِ شہر بھی ہے

کڑی ہے جنگ کہ اب کے مقابلے پہ فراز
امیرِ شہر بھی ہے اور خطیبِ شہر بھی ہے

ہواؤں کی بشارت

تمام ماؤں کے ہونٹ پتھر ہیں
اور آنکھوں میں زخم ہیں
اور دل تپکتے ہیں
رات کہتی ہے
"ان کے بیٹوں کو
شب گئے
چند لشکری
ساتھ لے گئے تھے
تو اب تک انکی واپسی کی خبر نہیں ہے"

نہ واپسی کا گمان رکھنا

ہوائیں سہمے ہوئے چراغوں سے کہہ گئی تھیں
کہ آنے والی رُتوں کے آغاز تک
تُمھارے نصیب میں روشنی کا کوئی سفر نہیں ہے
یہ مائیں پتھر بنی رہیں گی
اور اُنکے آنسو جمے رہیں گے
اور اُنکی آہیں تھمی رہیں گی
نہ جی سکیں گی
نہ مر سکیں گی

مت قتل کرو آوازوں کو

تُم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دل میں اُتارے جاتے ہو

ہم لوگ محبت والے ہیں
تم خنجر کیوں لہراتے ہو

اِس شہر میں نغمے بہنے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو

ہم پالنہار ہیں پھولوں کے
ہم خوشبو کے رکھوالے ہیں
تم کس کا لہو پینے آئے
ہم پیار سکھانے والے ہیں

اس شہر میں پھر کیا دیکھو گے
جب حرف یہاں مر جائے گا
جب تیغ پہ لے کٹ جائے گی
جب شعر سفر کر جائے گا

جب قتل ہوا سُر سازوں کا
جب کال پڑا آوازوں کا

جب شہر کھنڈر بن جائے گا
پھر کس پر سنگ اٹھاؤ گے
اپنے چہرے آئینوں میں
جب دیکھو گے ڈر جاؤ گے

○

عجب شہر تھے اور عجب لوگ تھے
ستم صورتیں تھیں غضب لوگ تھے

فقیر اس گلی کے گداگر سبھی
سراپا طلب بے طلب لوگ تھے

وہ کافر اکیلا کھنچا دار پر
نمازِ جنازہ میں سب لوگ تھے

انھیں راستوں پر کلاہیں گریں
انھیں رہگزاروں میں جب لوگ تھے

نہ مقتل نہ میلا تماشا کوئی
مگر جا بجا بے سبب لوگ تھے

سبھی سر بہ سجدہ تھے دربار میں
ہم ایسے کہاں بے ادب لوگ تھے

فراز اپنی بربادیوں کا سبب
نہ اب لوگ ہیں اور نہ جب لوگ تھے

○

یہ کس عذاب سے خائف مراقبیلہ ہے
کہ خون مل کے بھی چہروں کا رنگ پیلا ہے

یہ کیسی زہر بھری بارشیں ہوئیں اب کے
کہ میرے سارے گلابوں کا رنگ نیلا ہے

ہو کس طرح سے محبت کی گفتگو کہ ابھی
مرے لہو سے ترا فرش و سقف گیلا ہے

گداگرانِ سخن کو نوید ہو کہ یہاں
تنک سری ہی فقط رزق کا وسیلہ ہے

فرازؔ اسی لئے ہم زندگی پہ مرتے ہیں
کہ یہ بھی زندگی کرنے کا ایک حیلہ ہے

○

جنھیں زعمِ کمانداری بہت ہے
انھیں پر خوف بھی طاری بہت ہے

کچھ آنکھیں بھی ہیں بینائی سے عاری
کچھ آئینہ بھی زنگاری بہت ہے

نہ جانے کب لٹے گا شہرِ مقتل
سنا ہے اب کے تیاری بہت ہے

کچھ اب کے ٹوٹنا چاہتا خود بھی
کچھ اب کے وار بھی کاری بہت ہے

یہاں پیہم قبیلے قتل ہونگے
یہاں شوقِ عزاداری بہت ہے

شہر آشوب

اپنی بود و باش نہ پوچھو
ہم سب بے توقیر ہوئے
کون گریباں چاک نہیں ہے
ہم ہوئے تم ہوئے میرؔ ہوئے

سہمی سہمی دیواروں میں
سایوں جیسے رہتے ہیں
اس گھر میں آسیب بسا ہے
عامل کامل کہتے ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے
اِک شب جب شب خُون پڑا
گلیوں میں بارُود کی بُو تھی
کلیوں پر سب خُون پڑا

اب کے غیر نہیں تھا کوئی
گھر والے دُشمن نکلے
جن کو برسوں دُودھ پلایا
ان ناگوں کے پھن نکلے

رکھوالوں کی نیّت بدلی
گھر کے مالک بن بیٹھے
جو غاصب تھے محسن کُش تھے
صُوفی سالک بن بیٹھے

جو آواز جہاں سے اُٹھی
اس پر تیر تبر برسے
ایسے ہونٹ سلے لوگوں کے
سرگوشی کو بھی ترسے

گلی گلی میں بندی خانے
چوک چوک میں مقتل ہیں
جلادوں سے بھی بڑھ چڑھ کر
منصف وحشی پاگل ہیں

کتنے بے گنہوں کے گلے پر
روز کمندیں پڑتی ہیں
بوڑھے بچے گھروں سے غائب
بیبیاں جیل میں سڑتی ہیں

اس کے ناخن کھینچ لیئے ہیں
اس کے بدن کو داغ دِیا
گھر گھر قبریں در در لاشیں
بُجھا ہر ایک چراغ دِیا

ماؤں کے ہونٹوں پر ہیں نوحے
اور بہنیں کُرلاتی ہیں
رات کی تاریکی میں ہوائیں
کیسے سندیسے لاتی ہیں

قاتل اور درباری اس کے
اپنی ہٹ پر قائم ہیں
ہم سب چور لُٹیرے ڈاکو
ہم سب کے سب مُجرم ہیں

ہمیں میں کوئی صبح سویرے
کھیت میں مُردہ پایا گیا
ہمیں سا وحشت گرد تھا کوئی
چُھپ کے جسے دفنایا گیا

سارا شہر ہے مُردہ خانہ
کون اس بھید کو جانے گا
ہم سارے لاوارث لاشیں
کون ہمیں پہچانے گا

محاصرہ

مرے غنیم نے مُجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اُس کے
فصیلِ شہر کے ہر بُرج ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

وہ برق لہر بُجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجُودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بِچھا دیا گیا بارُود اُس کے پانی میں
وہ جُوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی

سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہُوئے
سپُردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہُوئے

تمام صُوفی و سالک سبھی شیوخ و امام
امیدِ لطف پہ ایوانِ کجکلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت حلف اُٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں

تُم اہلِ حرف کے پندار کے ثنا گر تھے
وُہ آسمانِ ہُنر کے نجُوم سامنے ہیں
بس اِک مصاحبِ دربار کے اشارے پر
گداگرانِ سخن کے ہجُوم سامنے ہیں

قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تُمھارے پاس ہے کون آس پاس تو دیکھو

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھ دو
وگرنہ اب کے نشانہ کمانداروں کا
بس ایک تم ہو، سو غیرت کو راہ میں رکھ دو
یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا

اُسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کسی خورشید کو شہید کرے
تو صبح اک نیا سورج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا مرے عدو کے لئے
کہ مجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اُسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بہت
اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کِسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

مرا قلم نہیں اوزار اُس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اُس دزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اُچھالتا ہے

مرا قلم نہیں تسبیح اُس مبلّغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لئے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

سرشتِ عشق نے افتادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی!